محمد جعفر شاہ پھلواروی

قرآن اور تمثیلات

کسی کو بات سمجھانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے عقلی استدلال۔ دوسرے جذباتی اپیل۔ تیسرے روحانی تاثیر۔ چوتھے تشبیہ و تمثیل اور پانچویں مادی طاقت کا استعمال۔ جب ہم اقلیدس کی شکل اشباتی کسی کو سمجھاتے ہیں تو وہاں صرف عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہاں نہ جذبات کو اُبھارتے ہیں۔ نہ روحانی زور لگاتے ہیں۔ نہ مثالیں دیتے ہیں نہ مادی طاقت کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اسی طرح اولاد کی محبت کا فلسفہ سمجھانے کے لیے صرف جذبات کو چھیڑ دینا کافی ہوتا ہے۔ وہاں نہ عقلی استدلال کا کام ہے نہ روحانی تاثیر کا۔ نہ تشبیہات کا اور نہ طاقت کا۔ یونہی بعض اوقات صرف روحانی تاثیر وہ کام کر جاتی ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ اپنی والدہ کی زبانی شانِ رسالت میں گستاخانہ کلمات سُن کر روتے ہوئے آتے ہیں۔ حضورؐ صرف اتنا فرماتے ہیں "اللھم اھد امّ ابی ھریرۃ" ابوہریرہؓ جب بادلِ ناخواستہ گھر واپس آتے ہیں تو والدہ کلمۂ شہادت ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہاں نہ عقل و فلسفہ تھا نہ تمثیلات نہ جذباتی اپیل، اور نہ مادی طاقت کا استعمال۔

اس وقت ان تمام طریقوں سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ یہاں صرف ایک ہی چیز پر گفتگو کرنی ہے۔ اور وہ ہے تشبیہات و تمثیلات سے سمجھانا۔ یوں تو تمام طریقہائے تفہیم اپنی اپنی جگہ کارگر اور سودمند ہیں اور کافی بھی ہیں۔ لیکن تمثیلاتی طریقہ اپنے اندر ایک عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ اس سے تین فائدے ہوتے ہیں۔

تمثیل کے فوائد

۱۔ اگر کوئی اور طریقہ پوری طرح کارگر نہ ہو تو صرف تشبیہات و تمثیلات سے بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

۲۔ اگر دوسرے طریقوں سے سمجھانے کے بعد بات سمجھ میں آگئی ہو، لیکن پوری طرح دماغ اسے گرفت نہ کر سکا ہو یا ابھی کچھ شکوک و شبہات باقی رہ گئے ہوں اور پوری تسکین نہ ہو سکی ہو تو تمثیلات سے یہ خلا پُر ہو جاتا ہے۔ اور تشبیہات اس کسر کو پورا کر دیتی ہیں۔

۳۔ اگر بات پوری سمجھ میں آگئی ہو تو تمثیلات سے مزید وضاحت اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور بات دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔

غرض تمثیلات کسی حالت میں بے فائدہ نہیں ہوتیں۔ یہ صحیح ہے کہ منطقی حیثیت سے مثال لنگڑی ہوتی ہے اور

چاروں پاؤں سے نہیں چلا کرتی لیکن بقول عارفِ رومی پائے استدلال بھی چوبیں اور بے تمکین ہوتا ہے۔ تشبیہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بعض اوقات تمام طریقہائے تفہیم کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ بلاشبہ تشبیہ و تمثیل کا وہ درجہ نہیں جو منطقی استدلال کا ہوتا ہے لیکن تفہیم کا مقصد عموماً اس کے بغیر تشنہ رہ جاتا ہے۔

تمثیل سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات عقلی و منطقی استدلال سے بڑی دیر میں یا بڑی مشکلوں سے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ تمثیل کے ذریعے بہت جلد اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ بے شمار انسان دنیا میں ایسے ہیں جن کے دماغوں کی ساخت دوسرے طریقہائے تفہیم کو جلدی قبول نہیں کرتی مگر مثالوں کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

تمثیل کی ضرورت

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر پیغمبر۔ ہر حکیم۔ ہر عاقل۔ ہر دانا۔ ہر خطیب۔ ہر مصلح۔ ہر مصنف اور ہر معلم کو تشبیہات اور تمثیلات سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ انہوں نے صرف عقلی استدلال پر اکتفا نہیں کر لیا۔ صرف جذبات کو ابھار کر نہیں چھوڑ دیا۔ محض طاقت کو حرکت میں لا کر الگ نہیں ہو گئے۔ اور فقط روحانی تاثیرات پر قناعت نہیں کی۔ وہ ہر ایک طریقے کو کام میں لاتے رہے۔ مگر تمثیلات و تشبیہات سے کسی کو مفر نہ ہو سکا۔ انہوں نے یہ تمام طریقہائے تفہیم اس لیے اختیار کیے کہ جو دماغ جس طریقے سے مناسبت رکھتا ہو گا وہ اسی راستے سے آئے گا۔ اور یہ تمثیلات اس کو اسی راستے سے ہدایت کی منزل تک آنے میں مدد دیں گی۔

انبیاء علیہم السلام میں سیدنا مسیح تمثیلات کے بادشاہ ہیں اور ایسی ایسی تمثیلیں دیتے ہیں کہ بڑے سے بڑا عقلی استدلال بھی وہاں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ حکماء و صوفیاء میں عقلی استدلال کے ساتھ تشبیہات کا امام شاید رومی سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

ان سب سے قطع نظر کر کے اگر آپ قرآنِ پاک اور احادیث نبوی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار ایسی تمثیلات و تشبیہات ملیں گی جن سے زیادہ چسپاں کوئی مثال، اور جن سے زیادہ مؤثر کوئی اور چیز نہیں مل سکتی۔ پورے قرآن اور تمام احادیث کی ساری مثالوں کو پیش کرنا مقصود نہیں اور نہ یہاں اس کا موقع ہے۔ ہم دونوں میں سے ہر ایک کی تھوڑی امثلہ یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن سے الٰہی تمثیلات اور نبوی تشبیہات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ اور پھر اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ہر صاحب علم نے تشبیہات کے ذریعہ کیوں بہت سے مسائل سمجھائے اور سلجھائے ہیں۔

قرآنی نظریہ تمثیل

قرآن کے پیش نظر صرف مقاصد تمثیلات ہی نہیں بلکہ ضروری اجزائے تمثیلات بھی ہیں۔ اس لیے قرآنی تمثیلات سننے سے پہلے یہ دونوں باتیں بھی سن لینی چاہئیں۔ اوّل تو قرآن کا نظریہ تمثیل ہے جس میں وہ بیان فرماتا ہے:

ان اللہ لا یستحیی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃً فما ۔۔۔ اللہ تعالیٰ کو مچھر یا اس سے بھی "کمتر" چیز کی مثال پیش کرنے میں

فوقہا فاما الذین آمنوا فیعلمون انہ الحق ، من ربہم و اما الذین کفروا فیقولون ماذا ، اراد اللہ بھٰذا مثلاً ..... — کوئی حجاب نہیں آتا ۔ ایمان والے لوگ تو ایسی مثال سن کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے ۔ لیکن اہل کفر یہ کہتے ہیں کہ اس سے خدا تعالیٰ کا مقصود کیا ہے ؟ .....

یہاں یہ چیز نوٹ کر لیجئے کہ قرآن میں کہیں بھی مچھر کی کوئی تمثیل بیان نہیں کی گئی ہے ۔ مکھی ۔ مگس شہد اور مکڑی کا تو ذکر ہے لیکن مچھر کا کہیں کوئی ذکر نہیں ۔ لیکن انہی چیزوں کے ذکر پر اہل کفر یہ طنز کرتے تھے کہ یہ کیا خدا کا کلام ہے جس میں مکھی مچھر کا ذکر ہوتا ہے ؟ اسی کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ مچھر تو الگ رہا اگر اس سے بھی کوئی حقیر چیز ہو تو مثال میں اسے پیش کرنے سے اللہ کو کوئی شرم نہیں آتی ۔ مطلب یہ ہے کہ مثال میں گھٹیا سے گھٹیا چیز بھی پیش کی جا سکتی ہے ۔ دیکھنے کی چیز "ممثل لہٗ" (جس چیز سے تشبیہ دی جائے) نہیں بلکہ "وجہ تشبیہ" کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یا نہیں ۔

تمثیل کے اجزائے سہ گانہ

تمثیل کے تین ضروری اجزا ہوتے ہیں ۔ مثال ۔ ممثل لہٗ اور وجہ تمثیل ۔ مثلاً "چاند جیسا چہرہ" ۔ اس میں "چہرہ" مثال ہے "چاند" ممثل لہٗ اور "حسن و جمال" وجہ تمثیل ۔ مثال میں ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی ہو یا زشتی ۔ ممثل لہٗ کو مثال سے برتر ہونا چاہیئے ۔ خوبی کا ذکر ہو تو خوبی میں اور زشتی کی تمثیل ہو تو زشتی میں ۔ لیکن اگر ایسا ممثل لہٗ موجود ہی نہ ہو وجہ تمثیل میں مثال سے برتر ہو تو مساوی یا کمتر ممثل لہٗ سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے ۔ قرآن کریم میں دونوں نظیریں موجود ہیں ۔

تمثیلات کے قرآنی مقاصد

ایک اور ضروری چیز بھی اس سلسلے میں ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ قرآن پاک نے امثلہ کے کئی مقاصد بتلائے ہیں مثلاً:

۱ ۔ ایمان کا امتحان جیسا کہ مذکورۂ بالا آیت (ان اللہ لا یستحی ..... الخ) میں مذکور ہے کہ اہل ایمان سن کر اسے من جانب اللہ حق تسلیم کر لیتے ہیں اور اہل کفر مذاق اڑاتے ہیں ۔

۲ ۔ تذکر جس کے معنی یاد کرنا جیسا کہ اس آیت میں ہے :

ولقد ضربنا فی ھٰذا القرآن من کل مثل لعلھم یتذکرون — ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں کو تذکر ہو ۔

ایک بھولی بسری بات دفعتاً یاد آ جائے تو اسے تذکر کہتے ہیں ۔ بعض مسائل کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ یوں دوسرے طریقوں سے سمجھ میں نہیں آتے ۔ لیکن مثال سے ان کو واضح کر دیا جائے تو اس طرح سمجھ میں آ جاتے ہیں جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ جائے ۔

۳ ۔ تفکر یعنی غور و فکر ۔ قرآن میں ہے :

وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون — ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے اس واسطے بیان کرتے ہیں کہ وہ تفکر کریں ۔

بسا اوقات ایک اعلیٰ سے اعلیٰ بات پر انسان دھیان نہیں دیتا لیکن اگر اسی کو مثال سے واضح کر دیا جائے تو خواہ وہ اس وقت اسے تسلیم نہ کرے مگر محض مثال کی بدولت وہ بات اس کے لیے قابل غور و فکر ہو جاتی ہے۔ سب کا خلاصہ یہی ہے کہ تمثیل و تشبیہ سے بات واضح ہو کر دل میں اتر جاتی ہے۔ اور جو چیز دوسرے طریقہائے تفہیم سے دیر میں اور بدقت سمجھ میں آتی ہے وہ تمثیل و تشبیہ سے جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب چند قرآنی تمثیلات پر غور کیجئے۔

چند قرآنی تشبیہات

منافقین کی تمثیل

منافقین کا ذکر کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا فلما اضاءت ما حولہٗ ذھب اللہ بنورھم وترکھم فی ظلمٰت لا یبصرون صم بکم عمی فھم لا یرجعون۔ او کصیب من السماء فیہ ظلمٰت ورعد وبرق یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم من الصواعق حذر الموت، واللہ محیط بالکٰفرین۔ یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہ واذا اظلم علیھم قاموا ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم وابصارھم ان اللہ علی کل شیء قدیر۔

ان کی مثال اس شخص جیسی ہے۔ جس نے آگ جلائی جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے نور کو لے گیا اور انہیں ایسی سخت تاریکی میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں پڑتا وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔ لہٰذا رجوع نہیں کرتے۔ یا جیسے آسمان سے زوردار بارش نازل ہو رہی ہو۔ جس میں تاریکیاں گرج اور چمک ہو۔ ہولناک آوازوں سے موت سے ڈر کر اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس رہے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی بینائیوں کو اُچک لیا چاہتی ہے۔ جب روشنی ہوتی ہے تو ذرا چل لیتے ہیں۔ اور جب تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کی سماعت و بصارت کو لے جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے (۲: ۱۷ تا ۲۰)

کتنی اعلیٰ نقشہ کشی ہے منکروں منافقوں کی نفسی کیفیت کی۔ ایک انقلابی اور آسمانی تحریک سے ہدایت کا نور پھیلتا ہے ماحول اس کی روشنی سے جگمگانے لگتا ہے۔ تو منافقوں کی نفسی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ داعی کو دیکھتے ہیں کہ یہ آدمی تو بہت معقول ہے اور بات بھی کچھ معقول کرتا ہے اس سے ان کے دل میں ذرا سی روشنی کی چمک آجاتی ہے۔ پھر ذرا دیر بعد وہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ انوکھی اور خطرناک باتیں ہیں۔ اب تک کسی اور نے یہ باتیں کیوں نہ کیں؟ یہ پیغام قبول کرنے کے لیے بڑی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا چھوڑو ان باتوں کو اور حسب معمول اپنے کام میں لگ جاؤ گویا وہ پھر روشنی سے تاریکی میں آجاتے ہیں اور الٹی مایوسی اور خوف شکست کی تاریکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی اندرونی کیفیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ نہ کوئی گفتگو ان کی سمجھ میں آتی ہے نہ وہ خود کوئی ڈھنگ کی بات کرتے ہیں۔ اور نہ انہیں اپنے مفر کا

کوئی راستہ سجھائی دیتا ہے۔ گویا بہرے، گونگے اور اندھے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی توفیق نہیں ہوتی کہ حق کی طرف رجوع کریں۔ دوسری مثال سے ان کی نفسی کیفیت کو اور بھی واضح کر دیا کہ زوروں کی گھٹا چھائی ہوئی ہو۔ موسلا دھار مینہ برس رہا ہو۔ خطرات کی بجلی کی گرج اور چمک سے دل دہل رہا ہو۔ ہر لحظہ بجلی کی کڑک سے پردہائے گوش پھٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ اور تیز چمک سے آنکھوں کی بینائی خطرے میں پڑی ہوئی ہو۔ ذرا امید کی روشنی دکھائی دی اور دو قدم چل لیے۔ پھر وہی تیرگی چھا گئی اور حیران ہو کر کھڑے ہو گئے۔ نہ آگے چلنے کا راستہ نہ پیچھے جانے کا موقع کیا بے بسی بے کسی اور حیرانی و پریشانی کا عالم ہو گا جب کہ انسان ایسی بھیانک حالت میں گھر جائے۔ بس بالکل یہی حال ان منکرین و منافقین کا ہے جو اسلام کے پھیلنے سے ان کے اندر پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اہل کفر کی مثال

کافروں کا نقشہ قرآن پاک یوں کھینچتا ہے:

ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء ونداءً صمٌّ بکمٌ عمی فھم لا یعقلون

کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پکارنے والا اسے پکارے جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہ سنے۔ یہ لوگ بھی بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ لہٰذا وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ (۲ - ۱۷۰)

ہر جانور کو کسی خاص قسم کی آواز سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے محبت کی باتیں بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے لیے محبت یا جھڑکی کے الفاظ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ بس وہ صرف آواز سنتا ہے۔ اور معانی سے واقف نہیں۔ ایک بکری سے آپ کہیں کہ فلاں کھیت میں نہ جایا کر۔ یا فلاں جگہ سے گھاس چرا کر۔ تو یہ جملے اس کے لیے بے معنی ہیں۔ اسے اتنی سمجھ ہی نہیں کہ وہ الفاظ کے معنی کو سمجھ سکے۔ کسی جملے کے معانی سمجھنے کے لحاظ سے جانور بھی بہرا گونگا اور اندھا ہی ہوتا ہے۔ پس ہدایت واضح ہونے کے بعد اس سے کفر و انکار کرنے والے جانور سے کچھ بھی مختلف نہیں ہوتے وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہوتے ہیں۔ جو الفاظ تو جانوروں کی طرح سن لیتے ہیں۔ لیکن ان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔

ایک دوسری جگہ ان ہی کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے:

لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغٰفلون۔

ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر وہ اس سے دیکھنے کا مقصد پورا نہیں کرتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کوئی تقاضا پورا نہیں کرتے۔ یہ لوگ چوپائے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ یہی تو ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۷ - ۱۷۹)

خدا تعالیٰ نے دل اس لیے دیا ہے کہ اس سے حق و باطل کا امتیاز کرے۔ آنکھیں اس لیے بخشی ہیں کہ ان سے

حق بینی کا کام لے۔ اور کان اس لیے عطا کیے ہیں کہ آوازِ حق کو سن کر قبول کرے۔ اگر ان نعمتوں کا یہ صحیح مصرف نہ لیا جائے تو جانور اور انسان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ مزید برآں اگر انسان انسان ہو کر بھی انسانیت کے تقاضے نہ پورے کرے تو فقط اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ جانوروں جیسا بن جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جانور پھر بھی اپنے فطری تقاضوں کو قانون قدرت کے مطابق پورا کر لیتے ہیں۔ اور انسان اتنا بھی نہیں کر پاتا۔ اس لیے قرآن نے ان کا کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے کہ یہ صرف جانور ہی نہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر اور ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

ذرا سوچیے کہ اگر انسان بھی صرف کھانے پینے اور نسل کشی کو اپنا مقصود بنا لے اور اعلیٰ اقدار سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ تو اس میں اور چوپائے میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ یقین کیجیے کہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل ہم سے کہیں بہتر طریقے سے چوپائے کر لیتے ہیں۔ نسل کشی میں بھی وہ انسان سے آگے ہیں۔ پھر اگر انسانی زندگی کا بھی فقط اتنا ہی مقصود ہو تو جانوروں پر اس کا شرف کیوں تسلیم کیا جائے؟ انسان کا شرف تو ہے ہی محض اعلیٰ اقدار کی وجہ سے۔ اگر یہی نہ ہو ـــــ (جس کا دوسرا نام کفر ہے) اور صرف جنسی و معاشی تقاضوں کی تکمیل انسان کا مقصد بن جائے تو وہ یقیناً چوپایوں جیسا ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہے۔ ان کی زندگی کے متعلق قرآن دوسری جگہ یوں ارشاد فرماتا ہے:

والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم	اہل کفر مزے اڑاتے ہیں۔ اور اسی طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا آگ ہے (۴۷۔ ۱۲)

گویا جانور محض طبعی تقاضے سے بھوک سے مجبور ہو کر کھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ انسان بھی کھاتے ہیں۔ بھوک دور کر کے زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہ جانوروں کے سامنے ہوتا ہے۔ نہ ان کے سامنے۔ بلکہ انسان اس ہوس میں اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اکتناز۔ احتکار۔ استحصال۔ اور اکل بالباطل بھی کرنے لگتا ہے۔ بخلاف جانوروں کے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ آگ ان کا ٹھکانا بن جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تمام کوششیں سوخت ہو جاتی ہیں۔

منفقین کی تشبیہ

راہِ خدا میں خرچ کرنے والوں اور ریاکاری کے لیے خرچ کرنے والوں کی مثالیں قرآن یوں دیتا ہے:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم۔ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا	جو لوگ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال یوں ہے جیسے ایک دانہ جو سات خوشے نکالے۔ اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اور اضافہ فرما دیتا ہے .....

منا ولا اذی لھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم و لاھم یحزنون - قول معروف ومغفرۃ خیر من صدقۃ یتبعھا اذی واللہ غنی حلیم - یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی - کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الاخر فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل الخ

جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک چٹان جس پر مٹی پڑی ہو پھر اس پر زوردار بارش ہو اور اسے صاف کرکے رکھ دے۔ جو محنت کی تھی اس میں سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے ...... الخ (۲-۲۶۰ تا ۲۶۶)

ایک اور جگہ دنیا داری کے لیے خرچ کرنے والوں کی مثال یوں دی ہے:

مثل ما ینفقون فی ھذہ الحیوۃ الدنیا کمثل ریح فیھا صر اصابت حرث قوم ظلموا انفسھم فاھلکتہ

جو لوگ حیات دنیا (ذلیل زندگی کے مقاصد) کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہوا جس میں پالا ہو اور وہ ظالموں کی کھیتی پر نازل ہو جائے۔ اور اسے برباد کرکے رکھ دے ..... (۳-۱۱۷)

اعلیٰ اقدار کے قیام کے لیے خرچ کرنے والوں اور پست و دنی مقاصد کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی کیا اس سے بھی بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے۔ کسی عمل کے بار آور ہونے اور رائگاں جانے کا نقشہ اس سے زیادہ دلکش انداز سے بھی کھینچا جا سکتا ہے؟ خرچ ابوبکر صدیقؓ نے بھی کیا۔ اور ابوجہل نے بھی کیا۔ خرچ عیش کے لیے بھی کیا جاتا ہے اور خرچ بندگانِ خدا کی بھلائی کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ خرچ فواحش کی راہ میں بھی ہوتا ہے۔ اور خرچ فواحش سے بچانے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ کیا یہ دونوں قسم کے خرچ برابر ہیں۔ اور کیا ان دونوں قسموں کے خرچ کے لئے قرآن کی مذکورہ بالا مثالوں سے بہتر مثال بھی ممکن ہے؟

دنی ومکذب کی مثال

پستی کی طرف جانے والوں۔ اپنی خواہش کی بندگی کرنے والوں اور آیاتِ الہٰی کی تکذیب کرنے والوں کی مثال یوں دی گئی ہے:

ولو شئنا لرفعنہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث اوتترکہ یلھث ذالک مثل القوم الذین کذبوا بایتنا فاقصص القصص لعلھم یتفکرون

(سورہ ۷۔ آیت ۱۷۵)

اگر ہم چاہتے (تو اپنی دی ہوئی آیات) کے ذریعے اسے بلند کر دیتے مگر وہ تو پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اپنی خواہش کی پیروی کرنے لگا بس اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر اس پر حملہ کرو جب بھی اپنی زبان نکالے اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی .....

کتا اگر تھکا ماندہ ہو یا گرمی اور پیاس کا مارا ہو تو زبان لٹکائے رہتا ہے۔ اس کو عربی میں لھث کہتے ہیں۔ یہ کتے کی ایک فطرت ہوتی ہے اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے جو دوڑ بھاگ کرتا ہے اس کے بعد

بھی وہ اپنی زبان باہر نکال لیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس پر حملہ کیا جائے یا اسے یونہی چھوڑ دیا جائے وہ زبان تو لٹکائے ہی رہے گا۔ یہ اس کی ایک فطرت ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہش کی بندگی کرنے کی وجہ سے پستی و دنائت کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ ان کی یہی پستیاں ان کو آیاتِ ربانی کی تکذیب پر مجبور کرتی ہیں اور یہ تکذیب ان کی ایسی فطرت بن جاتی ہے کہ آیاتِ ربانی کی زد خواہ ان پر پڑے یا نہ پڑے مگر وہ اپنی بدفطرتی کے باعث دونوں حالتوں میں آیاتِ الٰہی کی تکذیب کئے چلے جاتے ہیں۔

مشرکین کی تمثیل

غیر اللہ کو اولیاء و مددگار بنانے والوں کی تمثیل میں ارشاد ہے کہ

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل	جو لوگ اللہ کے سوا اولیاء بناتے ہیں ان کی مثال یوں ہے جیسے مکڑی
العنکبوت اتخذت بیتًا۔ ان اوھن البیوت	جس نے ایک گھر بنایا ہو (یعنی جالا تنا ہو) یقیناً کمزور ترین گھر مکڑی
لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون (سورہ ۲۹ : ۴۱)	ہی کا ہے۔ کاش یہ لوگ سمجھ سے کام لیتے۔ (۲۹-۴۱)

غیر اللہ میں جن ہستیوں کو مددگار و حاجت روا سمجھا جاتا ہے وہ کون کون ہیں؟ خدا تعالیٰ کے نیک بندے جو خود اپنی بہتیری حاجتیں پوری کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اور کون؟ اہل اقتدار جو اپنا اقتدار کھو کر اسے واپس نہیں لا سکتے۔ اور کون؟ فرشتے جو اپنی مرضی سے کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ اور کون؟ اصنام۔ چوپائے۔ شمس و قمر۔ دریا و بحر و بر وغیرہ۔ جو انسان کے خدام اور اس کے حیطۂ تسخیر کے قیدی ہیں۔ ان تمام متغیر۔ فانی اور آفل ہستیوں کو حاجت روا بنانے والے کیا فی الواقع مکڑی کا جالا نہیں بناتے؟ بلاشبہ مکڑی کا جالا ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ایک عجیب صنعت ہے۔ اس کا ہر تار چار چار ایسے تاروں کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک تار ایک ہزار تاروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ گویا ہر تار چار ہزار تاروں کا مجموعہ ہے۔ کوئی تیز و تند آندھی بھی اسے توڑ نہیں سکتی ان تمام محیر العقول صنعتوں اور حکمتوں کے باوجود تنکے کا ایک اشارہ اسے تار تار کر دیتا ہے۔ کیا واقعی اس سے بھی زیادہ کمزور کوئی گھر ہو سکتا ہے اور کیا دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی اپنی تمام قدرتوں کے باوجود حقیقی حاجت روا کے سامنے ایسی ہی بے بس نہیں جیسا مکڑی کا جالا ایک انگلی کی حرکت کے سامنے ہے؟ بے بسی اور کمزوری کی کیا اس سے بہتر مثال ممکن ہے؟ اسی کمزوری کو قرآن مجید ایک دوسری جگہ یوں بیان فرماتا ہے:

ان یسلبھم الذباب شیئًا لا یستنقذوہ منہ	ان سے ایک مکھی کوئی چیز لے لے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔

بے عمل حاملینِ تورات کی مثال

توریت کی ذمہ داری لے کر اسے نہ نبھانے والوں کے متعلق قرآن یوں تمثیل دیتا ہے:

مثل الذین حمّلوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل	جن لوگوں پر توریت کا بوجھ ڈالا گیا ہے اور اسے انہوں نے نہ اٹھایا

الحمار یحمل اسفاراً - بئس مثل القوم الذین کذبوا بآیات اللہِ -

ان کی مثال ایسے گدھے جیسی ہے کہ کتابوں کو لادے ہوئے ہو - کیا بُری مثال ہے ان لوگوں کی جو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں (۶۲:۵)

یہ تمثیل اتنی چسپاں ہے کہ فارسی زبان میں گویا ضرب المثل بن گئی ہے - شیخ سعدی نے بھی مضمون یوں ادا کیا ہے:

نہ محقق بود نہ دانشمند — چارپایہ برو کتابے چند

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود — باز آید ہنوز خر باشد

یہاں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اہل تورات ہونے کے دعوے کے ساتھ ساتھ حامل تورات نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اسے خود قرآن نے اسی آیت میں واضح کر دیا ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں - بظاہر تو یہ حاملین تورات کبھی تورات کو جھوٹا نہیں کہتے - پھر تکذیب کا کیا مفہوم ہوا؟ تکذیب کا قرآنی مفہوم یہی ہے کہ زبان سے اقرار ہو اور عمل سے انکار - زبانی مصدق اور عملی مکذب - پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تکذیب صرف عملی تکذیب کو نہیں کہتے لفظی پابندی کے پیچھے پڑ کر حکم کی اصلی روح اور سپرٹ کو برباد کر دینا بھی ایک قسم کی تکذیب ہی ہے - یہودی احبار و فقہاء کا یہی حال تھا - اور مسیحیت اسی ذہن کا ردِّ عمل تھی - ایسے فقہاء کی ہمارے یہاں بھی کمی نہیں جو فقط "لغتہائے حجازی کے قارون" ہیں - اور لفظی اقرار کے ساتھ تکذیب کے مرتکب -

نفسی کیفیت کی مثال

یکسو موحد اور منتشر الخیال مشرک کی نفسی کیفیت کو ایک مثال سے اللہ تعالیٰ یوں واضح فرماتا ہے:

ضرب اللہ مثلاً رجلاً فیہ شرکاء متشٰکسون ورجلاً سلماً لرجل ط ھل یستوین مثلاً ط ..... (۲۹:۳۹)

اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک آدمی جس کے کئی مالک ایک دوسرے سے جھگڑنے والے شریک ہیں - اور ایک آدمی جو پورے طور پر ایک آدمی کا نوکر ہے کیا ان دونوں کی حالت برابر ہے؟ ..... (۲۹:۳۹)

ایک کی رضا کے لیے سب کی رضا کو پس پشت ڈالنے والا بہرحال یکسو رہے گا - لیکن جو کئی ایک کی متضاد رضاؤں کو ایک ساتھ نبھانے کی کوشش کرے گا کبھی یکسو نہیں ہو سکتا - موحد یکسو اور حنیف ہوتا ہے - اور مشرک منتشر الخیال - اسی طرح دنیاوی کاروبار میں بھی جو شخص یکسو ہو کر ایک مقصد کے پیچھے لگا رہے وہ حنیف ہوگا اور کامیاب ہوگا - لیکن جس نے کئی نصب العین بنا رکھے ہوں وہ اپنی منتشر الخیالی کی وجہ سے کسی ایک میں بھی کامیاب نہ ہو سکے گا اس کی بہترین مثال یہی ہو سکتی ہے کہ وہ نوکر جو ایک آقا کا خادم ہو یکسوئی کے ساتھ اپنے تمام کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے گا - اور جس کے کئی آقا ہوں - اور وہ سب باہم ٹکر لینے والی خواہشیں رکھتے ہوں اسے سبھوں کے ساتھ نبھانا مشکل ہوگا - بلکہ ناممکن - قرآن نے "عبد" کی مثال دی ہے - تاکہ ہر شخص اپنی عبدیت و عبودیت کو ایک

طرف لگانے کا فیصلہ کرے اور موحد بن جائے۔ ورنہ شرک کی آلودگی کبھی اسے یکسو نہ ہونے دے گی۔ اور وہ کسی ایک کو بھی راضی نہ کر سکے گا۔

اہلِ شرک کی تشبیہہ

غیر اللہ کو خدائی کے منصب پر بٹھانے والوں کے لیے قرآن ایک مثال یوں بیان فرماتا ہے:

ضرب لكم مثلا من انفسكم ط هل لكم من ما ملكت ايمانكم من شركآء في ما رزقنكم فانتم فيه سَوَآءٌ تخافونهم كخيفتكم انفسكم .....

وہ تمہارے لیے تمہاری اپنی ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ کیا تمہارے ملوکوں میں سے کوئی تمہارے اس رزق میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے تمہارے برابر کا شریک ہے۔ اور تم کو ان کا اس طرح اندیشہ ہے جس طرح اپنا ہوتا ہے ..... (۳۰: ۲۸)

آقا اور غلام میں کوئی فرق بجز اس کے نہیں کہ غلام ایک اتفاقی شکستِ جنگ کے بعد قیدی ہو گیا ہے اور زرِ فدیہ ادا کرنے تک وہ اپنے آقا کے ہاتھ میں گرو ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ کل وہی آقا غلام اور وہ غلام اس کا مالک بن جائے یا کم از کم خود آزاد ہو جائے جو اسلام کا مقصد ہے۔ اس کے باوجود انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اس قیدی کو برابر کا درجہ نہیں دیتا۔ اپنی ملکیت میں برابر کا شریک نہیں سمجھتا۔ اور جس طرح قدم قدم پر اپنے نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے اس طرح اس زیر دست قیدی کے نقصان کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ غرض کسی طرح بھی اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ لیکن مخلوقات میں وہ کسی نہ کسی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اور کچھ نہیں سمجھتا کہ ساری کائنات جس حقیقی آقا کی غلام اور عبد ہے اس کے برابر یا اس کا شریک کوئی کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ مثال دے کر انسانی غیرت پر تازیانہ لگایا ہے کہ جس شرک کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے لیے کیونکر روا رکھتے ہو؟ تم اپنے جیسے انسان کو بھی اپنے برابر یا اپنا شریک بنانا روا نہیں رکھتے۔ لیکن حقیر مخلوقات کو بے تکلف خدا تعالیٰ کی بغل میں بٹھا دیتے ہو۔

نعمائے جنت کی تمثیل

جنت کی نعمتوں کو ایک مثال سے یوں واضح فرماتا ہے:

مثل الجنة التي وعد المتقون ط فيهآ انهٰرٌ من مآءٍ غير اسنٍ ج وانهٰرٌ من لبنٍ لم يتغير طعمه ج وانهٰرٌ من خمرٍ لذةٍ للشربين ج وانهٰرٌ من عسلٍ مصفى ط ولهم فيها من كل الثمرات ومغفرةٌ من ربهم ط

جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کی مثال یوں ہے کہ اس میں بوسیدہ نہ ہونے والے پانی کی نہریں ہیں۔ اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہیں بدلتا۔ اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کو مزہ دے۔ اور صاف شفاف شہد کی بھی نہریں ہیں۔ اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں اور ان کے رب کی طرف سے

(۴۷ - ۱۵) منفرت ..... (۴۷ : ۱۵)

یہی مضمون اختصار کے ساتھ دوسری جگہ یوں ہے :

مثل الجنۃ الّتی وعد المتقون ط تجری من تحتھا الانھرُ اکلھا دائمٌ وظلّھا .....
(۱۳ : ۳۵)

جس بہشت کا وعدہ اہل تقویٰ سے کیا گیا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ اس کے ماکولات اور اس کا سایہ دائمی ہے۔ .... (۱۳ : ۳۴)

یہ تمثیل بڑی معنی خیز اور بڑی بنیادی حقیقت کی حامل ہے۔ جنّت کا جو مادّی نقشہ عام طور پر ذہنوں میں ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو ہمیں اس دنیا میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ احادیث میں بہت صحیح وارد ہوا ہے کہ بہشت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ "لاعین رأت ولا اذن سمعت" نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں کی نعمتوں کی کیفیت اس قیاس سے کہیں بالاتر ہے جو یہاں آنکھوں اور کانوں کی راہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن نے جنّت کی تمام نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ حور و غلمان۔ محلات و قصور۔ باغ و بہار۔ روانی انہار۔ شادابی اشجار۔ لولو و مرجان۔ تکیہ و قالین۔ ساغر و مینا۔ جام لبریز وغیرہ۔ لیکن ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ان کی کیفیت اعلیٰ پیمانے پر وہی ہوگی جو یہاں کی زندگی میں ہوتی ہے۔ ہم اس کی نوعیت کی تعیین تو نہیں کر سکتے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں جہانوں کی کیفیت کی نوعیتیں بالکل جداگانہ ہیں اور نعمائے جنّت کا جو کچھ قرآن مجید نے ذکر کیا ہے وہ صرف ایک تمثیل ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے کہ مثل الجنۃ التی وعد المتقون الخ..... یعنی جس بہشت و باغ کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ ...... الخ مطلب یہ ہے کہ جن نعمائے بہشت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ایک تمثیلی کیفیت کا بیان ہے۔ اس کو بالکل ویسا ہی نہ سمجھ لینا جیسا دنیائے دنی کی نعمتوں کو سمجھتے ہو۔ جس طرح رحم کے اندر بچہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس شکم سے باہر ایک اور لاانتہا وسیع دنیا بھی ہے جس میں شمس و قمر چمک رہے ہیں۔ پرندے چہک رہے ہیں۔ ستارے اور برقی قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ طیارے اڑ رہے ہیں۔ ریڈیو بج رہے ہیں۔ انواع و اقسام کے سامان خورد و نوش موجود ہیں۔ حواس خمسہ کے لیے بے شمار سامان تفریح ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اِس دنیائے تنگ میں زندگی گزارنے والے اُس عالم کی رنگینیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا کوئی بہت دھندلا سا تصوّر آسکتا ہے تو انہیں چیزوں کی تمثیل سے آسکتا ہے جو یہاں اس عالم میں ہمارے حواس کی گرفت میں آتے رہتے ہیں۔

اس عالم میں ہمارا یہ حال ہے کہ یقینی طور پر درک ہونے والے مجردات کا ذکر بھی بغیر محسوسات کی تمثیل کے نہیں کر سکتے۔ ہم کہتے ہیں "اونچے خیالات۔ گہرا غور و فکر۔ وسیع تصوّرات" لیکن وہاں نہ کوئی اونچا

پہاڑ ہوتا ہے نہ گہرا کنواں اور نہ وسیع میدان۔ ہم بولتے ہیں "افکار کی پرواز" حالانکہ وہاں کوئی پر نہیں ہوتے۔ یہ سب مجردات ہیں۔ لیکن ان کے اظہار کے لیے ہم وہی ناقص الفاظ لاتے ہیں جو محسوسات کے لیے ہوتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر (غالب)

مولانا رومی نے خود ہی ایک اچھی مثال دی ہے کہ اگر تم ایک بچے کو "لذتِ جماع" کا مفہوم سمجھانا چاہو تو یہی کہو گے کہ حلوہ یا مٹھائی کھانے میں تمہیں جیسا لطف آتا ہے اس سے بھی کہیں زیادہ مزہ اس میں ہے۔ بچہ پھر بھی حقیقت نہیں سمجھ سکے گا کیونکہ اس کیفیت کی عکاسی کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں۔ جب وہ بالغ ہوگا تو کسی لفظ کے بغیر ہی ساری کیفیتوں کو سمجھ لے گا۔ بالکل یہی حال نعمائے جنت کا ہے۔ اسے سمجھانے کے لیے وہی الفاظ لانے پڑیں گے۔ جو روزمرہ کے محسوسات کے لیے لائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ فی الواقع اس کی کیفیت وہی ہوگی جو یہاں ہوتی ہے۔ اسی تشبیہ کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ جو نعمائے جنت مذکور ہوئے ہیں وہ ایک تمثیل ہے اس کیفیت کے لیے جس میں مسرت، اطمینان، امن و دوام وغیرہ کی ساری خوبیاں یکجا ہیں۔

نورِ خداوندی کی مثال

قرآن مجید کی سب سے زیادہ عجیب تمثیل وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کے نور اور اعمالِ کافرین کے لیے اختیار فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق جس میں ایک چراغ ہے۔ چراغ ایک شیشے میں ہے۔ شیشہ گویا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے جو ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے نہ غربی تیل خود ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر ہی اب روشن ہو چلا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو ہر شے کو جاننے والا ہے۔ پھر یہ نور بھی ان گھروں میں ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم و اذن دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اور ان میں اسی کا ذکر کیا جائے۔ ان میں صبح و شام ایسے لوگ اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ جن کو ذکرِ الٰہی سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے

يخافون يومًا تتقلب فيه القلوب والابصارُ ۝ ليجزيهم الله احسن ما عملوا ويزيدهم من فضله ط والله يرزق من يشاء بغير حساب ۝ والذين كفروا اعمالهم كسراب بقيعة يحسبه الظمان ماءً ط حتى اذا جاءه لم يجده شيئًا ووجد الله عنده فوفّٰه حسابه ط والله سريع الحساب ۝ اوكظلمت فى بحر لجّى يغشٰه موج من فوقه سحاب ط ظلمت بعضها فوق بعض ط اذا اخرج يده لم يكد يرٰها ط ومن لم يجعل الله له نورًا فما له من نورٍ ۝

(سورہ نور)

آیت ۳۵ - ۴۰

زکوٰۃ سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت - وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں پلٹ جائیں گی تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے کردار کا بہترین بدلہ دے اور جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے - اور جو کافر ہیں ان کے عمل اس چٹیل میدان کے سراب کی طرح ہیں جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے - یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا - اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے - تو وہ اسے پورا پورا اس کا حساب چکا دیتا ہے - اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے -

یا گہرے سمندر میں تاریکیاں جن کے اوپر ایک لہر چڑھی آ رہی ہے اور اس کے اوپر ایک اور لہر ہے - اور اس کے اوپر بادل ہیں - تاریکیاں ہیں جو ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی ہیں - جب وہ ہاتھ نکالتا ہے تو اسے دیکھ نہیں پاتا - اور جسے اللہ تعالیٰ روشنی نہ دے اس کے لیے کہیں کوئی روشنی نہیں -

ان آیات میں کئی تمثیلات ہیں - پہلی مثال اللہ کے نور کی ہے - مثال سے پہلے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے - جو چیزیں آپ کو ٹھوس نظر آتی ہیں وہ درحقیقت کچھ بھی نہیں - وہ سب مجموعہ ہیں جواہر فردہ کا اور جوہر فرد خود کیا ہے؟ صرف برقی لہریں ہیں - محض ایک عمل یا حرکت ہے جسے ارادۂ الٰہی وجود میں لایا ہے - روشنی دو طرح کی ہوتی ہے - ایک وہ جو آنکھوں سے نظر آتی ہے - اور ایک وہ جو عقل سے تعلق رکھتی ہے اور دل و دماغ کو روشن کرتی ہے - ان دونوں کا مصدر خدا تعالیٰ کا نور ہے - نور الٰہی ایک لطیف مجرّد شے ہے - اس کی تشبیہہ بہر حال محسوسات ہی سے دی جا سکتی ہے - اس لیے اسے ایک ایسے چراغ سے تشبیہہ دی ہے جو طاق میں رکھا ہوا ہو اور ایک صاف شفاف اور ستارے کی چمکتے جگمگاتے شیشے میں ہو - اس کا روغن بابرکت درخت سے لیا گیا ہو - درخت بھی ایسا جو شرقی ہے نہ غربی - روغن خود اتنا شفاف کہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ دکھائے بغیر ہی روشن ہوا چاہتا ہے -

دیکھئے روشنی کا کیا نقشہ کھینچا ہے - تیل روشن - شیشہ روشن - اور پھر چراغ روشن - نور علیٰ نور - پھر دیکھئے روشنی کی کوئی جہت - کوئی سمت اور کوئی مخصوص رخ نہیں ہوتا - وہ ہر طرف یکساں روشنی دیتی ہے - لیکن کمال یہ ہے کہ یہ نور ہی عام روشنی کی طرح شش جہت نہیں - اس کا تو وہ درخت بھی لاشرقی ولاغربی اور بے جہت ہے جس سے یہ روشن روغن نکالا گیا ہے - اور جو درخت ایسا ہمہ سو بے جہت ہو اس کا تیل، پھر اس تیل سے نکلنے والی روشنی - اللہ

اللہ۔ اس کی بے جہتی اور ہمہ سوئی کا کیا پوچھنا پھر وہ خدا تعالیٰ جس کی پیدا کی ہوئی روشنی ہمہ جہت ہے خود کتنا بے جہت ہوگا۔ یقیناً وہ خاص قوم کا خدا نہیں۔ وہ کسی مخصوص ملک کا خدا نہیں۔ وہ ہمہ جہت ہے اور ساری کائنات کا یکساں خدا ہے۔

ان کے اوپر کچھ مزید تنزیہات ہیں ان پر بھی غور کیجئے کہ وہ طاق جس میں یہ چراغ بے جہت ہے ایسے گھر میں ہے۔ ایسے خانۂ خدا میں ہے جس کے بارے میں اس کا حکم ہے کہ اسے ہر قید سے بلند رکھا جائے۔ اور اس میں اسی کا نام بلند ہو۔ پھر مزید تنزیہ یہ کہ اس میں کچھ مردانِ خدا اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ تسبیح کے معنی ہیں

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

ہر قید سے آزاد۔ ہر بالا سے بالاتر۔ ہر پہنچ سے اوپر۔ ہر فہم و عقل سے باہر۔ سب میں موجود۔ ہر ایک سے الگ۔ ساری کائنات کا نور مگر اپنی شخصیت میں جدا سب پر مہربان سب کا خدا۔

پھر یہ تنزیہ و تسبیح کرنے والے لوگ خود ایسے پاکیزہ کہ یا والہی ان کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ ان کی محبوب ترین "قدر" ہے جس سے نہ تجارت انہیں غافل کر سکتی ہے نہ بیع و شرا۔ انہیں صرف اس وقت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جب زاویۂ قلب و نظر بدل جائے گا اور سب کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی اصلی متاع یہی ذکر الٰہی ہے۔

اس نور کی داستان کے بعد پھر تاریکی سے تمثیل دی جاتی ہے اور اس تمثیل کے لیے منکرین کے اعمال کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اعمال کفار کی بھی دو تشبیہیں دی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ایک میدان میں سراب اس طرح چمک رہی ہو جس طرح پانی کی لہریں چمکتی ہیں۔ پیاسا اسے پانی سمجھ کر لپکتا ہے۔ جب آگے بڑھتا ہے تو اسے وہی سراب ملتی ہے اور پانی کی ایک بوند بھی نہیں ملتی۔ اس وقت وہ موت کو خدا کی شکل میں دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کا حساب کتاب چکا دیا جاتا ہے۔

ایک کافر و گمراہ کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ وہ اپنے کفر میں مگن رہتا ہے اور اس کے مطابق غلط اعمال کئے جاتا ہے۔ اسے بڑی بڑی خوش آئند امیدیں آگے بڑھاتی رہتی ہیں۔ مگر روح تشنہ رہتی ہے۔ ساری عمر ان ہی امیدوں میں ختم ہو جاتی ہے اور نتیجہ وہی تشنگی۔

اعمالِ کفر ہمہ تن تاریکی و تیرگی ہوتے ہیں۔ اس لیے دوسری مثال اس قسم کی دی گئی ہے کہ اوپر بادل گھرا ہے نیچے سمندر ہی نہیں بلکہ سمندر کی آخری تہہ جہاں موجیں ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی ہیں اوپر ابر سیاہ۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

اوپر ابتدائی آیت میں نور کی لطافت کو درجہ بدرجہ بلند کر کے پیش کیا گیا ہے اور یہاں تاریکی در تاریکی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہاں تیل روشن۔ شیشہ جگمگاتا ہوا۔ اور چراغ ضوفشاں ہے۔ یہاں سمندر کی گہرائی اس پر موج در موج اور اس پر گھنگھور گھٹا۔ وہاں نور علیٰ نور۔ یہاں ظلمتوں پر ظلمتیں۔

کیا نور اور ظلمت کی اس سے بہتر کوئی اور نقشہ کشی بھی ممکن ہے؟

حق و باطل کی مثال

حق اور باطل کی مثال دیتے ہوئے بقائے انفع یا بقائے اصلح کے قانون کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدًا رّابیًا ط ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ ط کذالک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ط کذالک یضرب اللہ الامثال

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا تو اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہنے لگے اور سیلاب جھاگ کو جو اوپر رہتا ہے بہا لے گیا اور اسی طرح کی جھاگ اس چیز میں بھی ہوتی ہے جسے لوگ زیور اور سامان بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں۔ حق اور باطل کی مثال اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے۔ میل کچیل تو بے مصرف ہو جاتا ہے۔ اور جو چیز نفع بخش ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اور اللہ اس طرح کی مثالیں بیان فرماتا ہے (۱۳: ۱۷)

"بقائے اصلح" کا فطری قانون یہ ہے کہ جس نوع کے افراد اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور تنازع للبقا میں صلاحیت کی بدولت تو افق پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ نوع باقی رہتی ہے اور غیر صالح انواع مٹ جاتی ہیں۔ قرآن پاک نے بقائے انفع کا قانون بتایا ہے جو بقائے اصلح سے بلیغ تر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ بے مصرف اور بے نفع چیزیں رائگاں جاتی ہیں اور وہ چیزیں باقی رہتی ہیں جو نفع بخش ہوں۔ انفع ہونے کے لیے اصلح ہونا بھی ضروری ہے۔ اور جو اصلح ہوگا وہ انفع بھی ہوگا۔ جو اس کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو کہ اپنے آپ کو بچا سکے وہ دوسروں کے لیے کیا نفع بخش ہوگا۔ بہر کیف قرآن پاک نے اس قانونِ فطرت کو سمجھانے کے لیے نہایت اعلیٰ مثال دی ہے کہ دیکھو سیلاب کی سطح پر بھی خس و خاشاک ہوتے ہیں۔ اور گلائی ہوئی دھات کی سطح پر بھی جھاگ آجاتی ہے مگر دونوں ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھینک دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح خالص اور مفید پانی جھاگ کے نیچے ہوتا ہے اسی طرح پگھلے ہوئے سونے چاندی کا خلاصہ بھی جھاگ کے نیچے ہوتا ہے۔ قرآن نے حق اور باطل کی یہ مثال دی ہے کیونکہ بسا اوقات باطل بڑے طوفانی انداز سے اوپر مسلط ہو جاتا ہے اور حق بظاہر اس کے نیچے دب جاتا ہے۔ لیکن باطل اوپر ہونے کے باوجود جھاگ اور خس و خاشاک کی طرح بہہ کر رائگاں جاتا ہے۔ اور حق زمین پر اس لیے باقی رہ جاتا ہے کہ اس میں نفع بخش ہونے کی صلاحیت ہے۔ وہ اصلح بھی ہے اور انفع بھی۔ انسان بے کار چیزوں کو پھینک دیتا ہے تو خدا تعالیٰ بے مصرف اور بے نفع انسانوں اور قوموں کو کیوں باقی رہنے دے گا۔ اعمال میں بھی یہی قانون چلتا ہے کہ بے نفع کام ضائع ہو جاتے ہیں اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور وہی کام بقا حاصل کرتے ہیں جو نفع بخش ہوں۔